بریلوی جماعت اور جہادِ آزادی

پروفیسر محمد سلیمان اظہر ایم اے ۔ لائل پور

بریلوی فتنہ کا نیا روپ

علامہ فضل حق خیر آبادیؒ

تصویر کا دوسرا رُخ

ترجمان اہل سنت کراچی کے جنگِ آزادی نمبر پر چند گذارشات آپ ذی قعدہ کے الحق میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ یہ نمبر تاریخ نہیں بلکہ تاریخ سازی کا شاہکار ہے۔ ہم اپنے ان کرم فرماؤں کو آئینہ دکھانا چاہتے ہیں اگرچہ ہمیں خدشہ ہے کہ صورت حال کی صحیح تصویر سامنے آنے پر یہ لوگ بُرا مان جائیں گے۔ لیکن ہم زہر ہلاہل کو قند سمجھ کر نہ خود نگلنے کے روادار ہیں اور نہ عوام کو فریب میں مبتلا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ نقار خانے میں طوطی کی نحیف آواز نہیں سنی جاتی لیکن کوئی سنے نہ سنے ہمیں اپنا فرض بہر حال ادا کرنا ہے۔
ہم آج کی مجلس میں علامہ فضل حق خیر آبادی کا ذکر خیر کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ جنگِ آزادی نمبر میں جس انداز سے آپ کی قصیدہ خوانی کی گئی ہے۔ اس کی بنا پر اگر اسے فضل حق نمبر کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔
حیرت ہے کہ آج بریلوی حضرات انگریز دشمنی کے نعرے لگاتے ہیں۔ لیکن جب انگریز یہاں تھا تو ان لوگوں نے کاسہ لیسی کی انتہا کر رکھی تھی۔
مرحوم آغا عبدالکریم شورش کاشمیری نے مولانا ظفر علی خان کے سوانح حیات کے صفحہ ۱۸۱ پر لکھا تھا:

> "مولانا کا ایک ہدف متصوفین کا وہ قبیلہ نامراد ہے جس کے افراد ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے سایہ ہما پایہ کو ظلِ الٰہی سمجھتے اور اپنے عقائد کی شطحیات کے باعث مسلمانوں میں ایک جان لیوا مرض کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ اس طائفہ مقدسہ کے خلاف مولانا (ظفر علی خان) نے سب سے زیادہ جہاد اس وقت کیا جب زمیندار بند کر دیا گیا۔ اور اس کی جگہ ستارۂ صبح نکالا۔ پھر زمیندار کے دور ثانی میں ان بزرگوں کی کاسہ لیسی کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے سر مائیکل اوڈوائر کو جلیانوالہ باغ کے قتل عام پر سپاسنامہ پیش کیا۔ اور جنگِ عظیم میں خلافتِ اسلامیہ کی بیخ کنی کو اپنے تعویذی کرامات کا نتیجہ کہا۔ ان کے نزدیک ترک کافر تھے۔ جن کی گولیاں ان کے تعویذوں کی برکت سے برطانوی سپاہ کے

ہندوستانی اجیروں پر کوئی اثر نہ کر سکتی تھیں۔"

دیکھا آپ نے ان مجاہدین حریت کا کردار۔ ترک جانبازوں پر انگریز کے زیر کمان گولیاں ان لوگوں نے چلوائیں۔ ان کے نزدیک صرف ترک ہی کافر نہ تھے، بلکہ ہندوستان کے بھی تمام مجاہدین آزادی جنہوں نے کسی بھی طریق سے انگریز کی غلامی کا جوا اتارنے کی کوشش کی، دائرہ کفر میں شامل تھے۔

بریلی کے پریس سے ایک کتاب "تجانب اھل السنة من اھل الفتنه" شائع ہوئی، جس میں ہندوستان کے کسی قابلِ ذکر مسلمان کو کافر کہے بغیر نہیں چھوڑا۔ مثلاً:

"بحکم شریعت مسٹر جناح اپنے کفریہ عقاید کی بناء پر قطعاً مرتد اور خارج از اسلام ہے۔" صـ ۱۲۲

اور اسی جناح کی کاوشوں سے وجود میں آئے ہوئے پاکستان میں یہ لوگ دندناتے پھر رہے ہیں۔ اور تحریک آزادی کے محرک اور روح رواں ہونے کے مدعی بنے بیٹھے ہیں۔ ان لوگوں نے بے چارے قائداعظم ہی پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا بلکہ:

"فرقہ احرار بھی فرقہ نیچریہ کی ایک شاخ ہے۔ اس فرقہ کے بڑے بڑے مکلبین (کتے) یہ ہیں: ایڈیٹر النجم عبدالشکور کاکوروی۔ صدر مدرسہ دیوبند حسین احمد اجودھیا باشی۔ بشیر احمد دیوبندی عطاءاللہ بخاری۔ حبیب الرحمان لدھیانوی۔ کفائت اللہ عبدالغفار سرحدی گاندھی۔ اس فرقہ کا سرغنہ مسٹر ابوالکلام آزاد ہے۔ جو امام الاحرار کہلاتا ہے۔" صـ ۱۶۰

اور:

"ان صلح کل لیڈروں میں اعظم گڑھ کے مولوی شبلی۔ اور الطاف حسین حالی اور زمانہ حال کے مشہور شاعر ڈاکٹر اقبال بہت نمایاں ہیں۔ ان کی صلح کلیت اپنی حد سے گذر کر شدید نیچریت اور دہریت تک پہنچی ہوئی ہے۔" صـ ۲۸۹

اور جوں جوں کتاب اختتام کی جانب رواں ہے، لہجہ تلخ تر ہوتا جا رہا ہے۔ لکھا ہے:

"وہابیہ۔ دیوبندیہ۔ قادیانیہ۔ روافض۔ نیاچرہ۔ خاکساریہ۔ چکڑالویہ۔ احراریہ۔ جٹادھاریہ (خواجہ حسن نظامی کے مرید) آغاخانیہ۔ وہابیہ غیر مقلدین و وہابیہ نجدیہ۔ ولیگیہ نمالیہ وصلح کلیہ غالیہ اپنے عقائد کفریہ کی بناء پر بحکم شریعت قطعاً یقیناً اسلام سے خارج اور کفار مرتدین ہیں۔ جو مدعی اسلام ان میں سے کسی کے قطعی یقینی کفر پر یقینی اطلاع رکھتے ہوئے بھی ان کو کافر و مرتد کہنے میں توقف کرے وہ بھی یقیناً کافر و مرتد ہے اور بے توبہ مرا تو مستحق نار ابد ہے۔" صـ ۲۵۳

ہم حیران ہیں کہ قائداعظم محمد علی جناح۔ علامہ سر محمد اقبال۔ مولانا الطاف حسین حالی وہابیوں، دیوبندیوں، خاکساروں،

احراریوں اور مسلم لیگیوں کا انگریز کے خلاف جدوجہد کے سوا اور کون سا جرم تھا جس نے مزاج یار اس قدر برہم کر رکھا ہے۔ جب جدوجہد کا وقت تھا تو حضرات بریلی کی تلوار مجاہدین آزادی کے خون سے غسل کر رہی تھی اور جب آقایان ولی نعمت ان کی خواہشات کے علی الرغم بوریا بستر سمیٹ کر سمندر پار چلے جانے پر مجبور ہو گئے اور ان کی عظمت کا آفتاب گہنا گیا تو آج جنگ آزادی نمبر شائع کر کے مجاہدین و شہداء حریت کی ارواح سے سنگین اور شرمناک مذاق کیا جا رہا ہے۔ خیر ؎

ستم گر تم سے امید کرم ہو گی جنہیں ہو گی ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ تو ظالم کہاں تک ہے۔

اب ہم تمہیدی گذارشات ختم کر کے اس شخصیت کیطرف آتے ہیں جو آج کی گفتگو کا عنوان ہے۔

ہم علامہ فضل حق خیر آبادی کی علمی وجاہت کو سلام کرتے ہیں۔ وہ ایک متبحر عالم دین تھے۔ انہوں نے بعض اکابر مثل حضرۃ الامام شاہ محمد اسماعیل شہید دہلوی سے بعض مسائل میں اختلاف بھی کیا۔ اور بڑے زور شور سے اپنا موقف امت کے سامنے رکھا۔ لیکن جب ان پر حقیقت حال منکشف ہوئی تو ایک سچے عالم دین کی طرح اپنی غلطی پر نادم ہوئے اور مخالف کی عظمت کا بھرپور انداز میں اعتراف کیا مولانا اشرف علی تھانویؒ حکایات اولیا میں مولانا فضل حق کے یہ الفاظ نقل کرتے ہیں۔

"میں اور شاہ اسماعیل پر تبرئی کروں۔؟ جو کچھ اختلاف ہوا وہ بھی بہکائے سکھائے سے ہوا تھا اب وہ بھی نہیں ہو سکتا۔"

اور مرزا حیرت دہلوی "حیاۃ طیبہ" میں شاہ اسماعیل کی خبر شہادت مولانا فضل حق کو ملنے پر ان کے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ وہ خاموش بیٹھے رہے، پھر فرمایا:

"ہم اسماعیل کو مولوی نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ امت محمدیہ کا حکیم تھا۔ کوئی شے نہ تھی جس کی انیت و لمیت اس کے ذہن میں نہ ہو۔ امام رازی نے اگر کچھ حاصل کیا تو دود چراغ کھا کر اور اسماعیل نے محض اپنی قابلیت اور استعداد سے۔" (بحوالہ اکمل البیان مطبوعہ لاہور، ص ۸۰)

اور امیر الروایات مطبوعہ محبوب المطابع دہلی کے ص ۱۶ پر یہ روایت موجود ہے:

"خاں صاحب نے فرمایا کہ مفتی عنایت احمد صاحب۔ مولوی فضل حق صاحب۔ نواب عبداللطیف خاں شیخ مہدی بخش سہارنپوری۔ یہ سب رنگون میں ایک جگہ مقید تھے۔ آخر میں سب کی رہائی کا حکم آ گیا تھا مگر آخر کے تین حضرات رہائی کا حکم آنے تک انتقال کر چکے تھے اور مفتی عنائت احمد صاحب چھوٹ کر آئے۔ مفتی صاحب نے ہندوستان آکر بیان فرمایا کہ مولوی فضل حق صاحب بہت نادم تھے اور روتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ مجھ سے سخت غلطی ہوئی کہ میں نے مولوی اسماعیل صاحب کی مخالفت

کی۔ وہ بیشک حق پر تھے۔ اور میں غلطی پہ تھا مجھ پہ جو یہ مصیبت پڑی یہ میرے اپنی اعمال کی سزا ہے۔ میری مولوی اسماعیل سے دوستی تھی اور میں بھی ان کے ساتھ شہید ہوتا۔ مگر کیا کیجئے بدایوں والوں نے ابھار کر ان سے بھڑوا دیا۔ اور علم کے غرّہ میں حق کو باطل کرنے پہ تل گیا۔ تم لوگ گواہ رہنا کہ میں اپنے خیالات باطلہ سے توبہ کرتا ہوں۔ اور اگر میں رہا ہو گیا تو اپنی توبہ شائع کروں گا۔"

اپنی غلطی کو تسلیم کر لینے والا یہ عظیم انسان خیر آباد کے مشہور علمی گھرانے میں مولانا فضل امام خیر آبادی کے گھر ۱۲۱۲ھ بمطابق ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوا۔ ذہانت و فطانت ورثہ میں پائی۔ ۱۳ سال کی عمر میں علوم متداولہ کی تحصیل سے فارغ ہو گئے۔ والد سرکار انگریزی کے ریذیڈنٹ دہلی کے دفتر میں صدر الصدور رہتے۔ ان کی وفات کے بعد ۲۸ سال کی عمر میں آپ بھی اسی مسند پر فائز ہوئے۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ عربی نظم و نثر کے قادر الکلام ادیب و شاعر تھے۔ کم و بیش چوبیس کتابوں کے مصنف تھے۔ جن میں ہدیہ سعیدیہ اور شرح مسلم شہرۂ آفاق کتابیں ہیں اور برّ صغیر کے درس نظامی میں پڑھائی جاتی ہیں۔ خود بھی درس و تدریس میں مصروف رہے۔ طبیعت شاہانہ پائی تھی۔ ساری عمر انگریزوں، نوابوں اور راجوں کی ملازمت میں گذاری۔ جب ۱۸۵۷ء کا معرکہ کارزار بپا ہوا تو آپ ہندو راجہ الور کے ہاں ملازم اور دہلی سے باہر تھے۔ ہمارے بریلوی تاریخ سازوں کو اس بات پر اصرار ہے کہ آپ نے جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ اور وہ فتویٰ جہاد جو ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء کو دہلی میں جاری ہوا تھا، وہ آپ ہی کی تحریک کا نتیجہ تھا۔ یہ پروپیگنڈہ اتنی شد و مد سے کیا گیا ہے کہ مولانا غلام رسول مہر مرحوم جیسے بالغ نظر مؤرخ بھی اس کے دھارے میں بہہ گئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوتے وقت مولانا الور میں تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں بیٹھے ہوئے نشر و اشاعت کرتے رہے۔ اور اگست ۱۸۵۷ء میں دہلی پہنچے۔ (بحوالہ الثورۃ الہندیہ صد ۱۵۲) مجھے اس نشر و اشاعت کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔ دہلی پہنچنے کے بعد جس حد تک میں معلوم کر سکا ہوں وہ دربار میں آتے جاتے ضرور تھے۔ بادشاہ سے مل کر باتیں بھی کرتے تھے۔ بعض اوقات فرامین بھی لکھتے تھے، لیکن ان سے کوئی خاص کام نہ لیا گیا۔" (اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۶۰ء صد ۲۰۴)

اس کے بعد لکھتے ہیں:

"مولانا کے دہلی پہنچنے سے پیشتر بھی بعض مسلمانوں نے علم جہاد بلند کیا تھا۔ مولانا پہنچے تو مسلمانوں کو جنگ پہ آمادہ کرنے کی غرض سے باقاعدہ ایک فتویٰ مرتب ہوا جس پہ علماء دہلی کے دستخط لئے گئے۔ میرا خیال ہے کہ یہ فتویٰ مولانا فضل حق ہی کے مشورے سے تیار ہوا تھا۔ اور انہوں نے ہی علماء کے نام تجویز کئے تھے جن سے دستخط لئے گئے۔ غالباً یہی فتویٰ تھا جو انجام کار مولانا کے خلاف مقدمے کا باعث بنا ورنہ

انہوں نے نہ کسی جنگ میں حصہ لیا۔ نہ ان کے پاس کوئی عہدہ تھا نہ کسی کے قتل میں شرکت کی تھی۔ اور نہ ان کے خلاف کوئی اور سنگین الزام تھا۔" صـ۲۰۶

اور دورانِ سماعت الثورۃ الہندیہ صـ۱۶۸ کی اس عبارت:

"چند الزام اپنے اوپر خود ہی قائم کئے پھر خود ہی مثل عنکبوت عقل و قانونی ادلّہ سے توڑ دئے۔ جج یہ رنگ دیکھ کر پریشان تھا۔ اور ان سے ہمدردی بھی تھی۔ جج نے صدر الصدوری کے عہد میں مولانا سے کچھ عرصہ کام سیکھا تھا۔ دوسرے دن مولانا نے مخبری کی تصدیق کر دی اور کہا کہ واقعی یہ فتویٰ میں نے دیا تھا۔ گواہ نے پہلے سچ کہا تھا۔ اب میری صورت دیکھ کر مرعوب ہو گیا۔ اور اس نے جھوٹ بولا۔ فتویٰ میرا لکھا ہوا ہے اور آج بھی میری یہی رائے ہے۔"

پر تبصرہ کرتے ہوئے مہر مرحوم اپنی کتاب کے صـ۲۰۷ پر لکھتے ہیں:

"یہ بیان میرے نزدیک محل نظر ہے۔ اصل معاملہ بے حد نازک تھا۔ اور اس کے ساتھ مولانا کی زندگی وابستہ تھی۔ یہ بات ذہن میں نہیں آسکتی کہ انہوں نے اسے اپنے علمی کمالات یا زور استدلال کی نمائش کا ذریعہ بنالیا ہو۔ اس طرح کہ کبھی اپنے اوپر الزام لگائے اور کبھی رد کر دئے۔ پھر خود ہی ہر الزام کا اقرار کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ معقولات میں مولانا کی یگانگی کے پیش نظر لوگوں نے بطور خود داستان بافیاں کرلیں۔ عجیب بات ہے کہ جس جج کو مولانا کا شاگرد ظاہر کیا گیا ہے اور ہمدرد بتایا گیا ہے اس کے متعلق خود مولانا اپنی کتاب میں فرماتے ہیں: "میرا معاملہ ایسے ظالم حاکم کے سپرد کر دیا۔ جو مظلوم پر رحم کرنا ہی نہ جانتا تھا ...... اس ظالم نے میری جلا وطنی اور عمر قید کا فیصلہ کر دیا۔" (بحوالہ الثورۃ الہندیہ صـ۱۱۳)

مرحوم مہر صاحب کی نگارشات آپ نے ملاحظہ کرلیں۔ ان کے نزدیک جنگ آزادی میں مولانا کا حصہ فتویٰ جہاد کے سوا کوئی نہیں ہے۔ لیکن یہاں وہ بھی بھول گئے ہیں۔ کیونکہ وہ خود فرما چکے ہیں کہ آپ ورود دہلی اگست کی بات ہے۔ اور یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ فتویٰ جہاد کا اجراء ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء جمعہ کے روز ہوا۔ جب کہ مولانا دہلی سے باہر الور میں تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس فتویٰ پر مولانا کے دستخط بھی موجود نہیں ہیں۔ پھر بھی جناب عبدالحکیم شرف القادری صاحب باغی ہندوستان کے حرفِ آغاز میں صـ۲۳ پر کس قدر ڈھٹائی کے ساتھ اس حقیقت کو نظروں سے اوجھل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"اس دور کے تاریخی روزنامچوں سے ۱۶ اگست ۱۸۵۷ء کو علامہ (فضل حق) کی بہادر شاہ کے دربار میں موجودگی کا ثبوت ملتا ہے۔ اس سے یہ یقین کیسے پیدا ہو گیا کہ علامہ سے پہلے دہلی میں نہ تھے۔ پھر اپنے دعوے کو ثابت کرنے کیلئے مخالفین کو یہ بھی ثابت کرنا پڑے گا۔ کہ دہلی سے صرف ایک ہی

فتویٰ جاری ہوا تھا جس کی نقل صادق الاخبار میں چھپی تھی:

دیکھ لیجئے کیا اسی کو چوری اور سینہ زوری نہیں کہتے۔ دعویٰ آپ کا ہے کہ مولانا فضل حق نے فتویٰ جاری کیا یا کرایا۔ اور ثبوت ہم سے مانگا جارہا ہے۔ ہم گھر بیٹھ کر تاریخ نہیں بناتے کہ کسی کو خواہ مخواہ ہیرو بنانے کیلئے ایک عدد فتویٰ بھی گھڑ لیں۔ یہ کام آپ کو مبارک۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ابھی تک منظر عام پر آسکا ہے۔ اس کے مطابق فتویٰ ایک ہی جاری ہوا تھا جس پر آپ کے خود ساختہ مجاہد کبیر کے دستخط نہیں ہیں۔ اگر آپ کو اپنے دعویٰ پر اصرار ہے۔ تو آپ کوئی دوسرا فتویٰ پیدا کیجئے خواہ جعلی ہی سہی۔ ہم اس جھنجھال میں کیوں پڑیں۔ نیز جن روز ناموں میں مولانا کی ۱۶ اگست کو بہادر شاہ ظفر کے دربار میں موجودگی کا ذکر ملتا ہے۔ وہیں یہ بھی موجود ہے۔ کہ آپ اس سے قبل دہلی سے باہر تھے۔ اور ۱۶ اگست کو دربار میں پیش ہونے کے ساتھ ہی بادشاہ سے حصولِ منصب کی درخواست کر دی اور یہ درخواست اتنی شد و مد اور بے صبری سے کی گئی کہ خود بادشاہ کو یہ کہنا پڑا کہ مولانا ذرا صبر کیجئے۔ تفصیل کیلئے وہی روز نامچہ ملاحظہ کر لیجئے جس میں ۱۶ اگست کو دربار میں آپ کی حاضری کا ذکر ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ جنگِ آزادی مئی ۱۸۵۷ء کے پہلے عشرے میں شروع ہوئی اور ستمبر کے نصف تک ختم ہو چکی ہے۔ ۱۶ اگست تک جنگ کو شروع ہوئے ۳ ماہ ہو چکے تھے اور باقی ایک ماہ کی کارگذاریاں باقی ہیں۔ اگر آپ انہیں مجاہد کبیر ثابت کرنا ہی چاہتے ہیں تو گذشتہ ۳ ماہ کے دوران آپ کی جنگی کارروائیوں کی مفصل روئداد بھی پیش کرنا ضروری ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ وہابی جنرل بخت خاں ہندوستانی افواج کا سپہ سالار اور دہلی کا گورنر تھا۔ وہ اس جنگ کا ہیرو ہے۔ فتویٰ جہاد اسی نے جاری کرایا۔ جنگ اسی کی قیادت میں لڑی گئی۔ اگر مرزا مغل اور دیگر شہزادوں کی ناتجربہ کاری آڑے نہ آتی یا بہادر شاہ ظفر سقوطِ دہلی کے مراحل میں اس کے ساتھ دہلی سے نکل جانے پر رضامند ہو جاتا تو حالات یقیناً مختلف ہوتے۔ اس کی جدوجہد آزادی اور یومیہ کارروائیوں کا ریکارڈ موجود ہے۔ اس لئے کہ وہ حقیقتاً مجاہد کبیر تھا۔ آپکے خود ساختہ مجاہد کبیر کے دامن میں ایک فتویٰ کے سوا اور کیا ہے۔ اور فتویٰ بھی وہ جس کا تختۂ ارض پر کوئی وجود نہیں ہے۔ جو فتویٰ جہاد موجود ہے، اس پر نہ علامہ کے دستخط ہیں نہ آپ کے بدایونی خانوادے کے کسی فرد کے دستخط ہیں۔ اور نہ آپ کے بریلوی خاندان کے کسی اہلِ علم کے دستخط ہیں۔ اس کے باوجود اصرار ہے کہ جنگ کا سروسامان ہم نے مہیا کیا۔ جہاد کی روح ہم نے پھونکی۔ انقلابی اور فوجی اقدامات ہم نے کئے۔ ایسی بے بنیاد باتیں اپنے حواریوں کے سامنے میں تو چل جاتی ہیں لیکن جرح و تعدیل کا ایک ہلکا سا وار بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔ پہلے ۱۸۵۷ء میں بریلویوں کا وجود تو ثابت کیجئے۔

مولانا فضل حق خیرآبادی کا ہم بدل و جان احترام کرتے ہیں۔ لیکن وہ درس و تدریس کے اور سرکاری درباری انسان تھے۔ ان کے نابغہ عصر ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن مجاہد حریت کا کانٹوں بھرا تاج ان کے سر پہ پورا نہیں آتا

، اگر آپ جبراً پہنانے کی کوشش کریں تو ان کا سر درد کرنے لگتا ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں:

"مکر و تلبیس سے نصاریٰ نے جب مجھے قید کر لیا تو ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے اور ایک سخت زمین سے دوسری سخت زمین میں منتقل کرنا شروع کیا۔ مصیبت پر مصیبت اور غم پر غم پہنچایا۔ میرا جوتا اور لباس تک اتار کر موٹے اور سخت کپڑے پہنا دئے۔ نرم و بہتر بستر چھین کر خراب، سخت اور تکلیف دہ بچھونا حوالہ کر دیا۔ گویا اس پر کانٹے بچھا دئے تھے۔ یا دہکتی ہوئی چنگاریاں ڈال دی گئی تھیں۔ میرے پاس لوٹا، پیالہ اور کوئی برتن تک نہ چھوڑا۔ بخل سے ماش کی دال کھلائی اور گرم پانی پلایا" (باغی ہندوستان ص۲۹۱)

، اور کالا پانی کے متعلق لکھتے ہیں:

"اسکی نسیم صبح گرم و تیز ہوا سے زیادہ سخت اور اسکی نعمت زہر ہلاہل سے زیادہ مضر تھی۔ اسکی غذا حنظل سے زیادہ کڑوی۔ اس کا پانی سانپوں کے زہر سے بڑھ کر ضرر رساں۔ اس کا آسمان غموں کی بارش کرنے والا۔ اسکی زمین آبلہ دار۔ اس کے سنگریزے بدن کی پھنسیاں اور اسکی ہوا ذلت و خواری کی وجہ سے ٹیڑھی چلنے والی تھی۔ ہر کوٹھری پر چھپر تھا جس میں رنج و مرض بھرا ہوا تھا۔ میری آنکھوں کی طرح اس کی چھتیں ٹپکتی رہتی تھیں۔ (باغی ہندوستان ص۲۹۲)

اور:

"یہ ناقابلِ برداشت حالات تھے ہی کہ میں متعدد امراض میں مبتلا ہو گیا جسکی وجہ سے میرا صبر مغلوب میرا سینہ تنگ، میرا چاند دھندلا اور میری عزت ذلت سے بدل گئی۔ میں نہیں جانتا کہ اس دشوار و سخت رنج و غم سے کیوں کر چھٹکارا ہو سکے گا" (ص ۲۹۳)

حضرات دیکھا آپ نے بریلویوں کا خود ساختہ مجاہد کبیر جہادِ آزادی کی راہ میں پیش آمدہ مصائب سے کسطرح بلبلا رہا ہے۔ درست بات یہی ہے کہ آپ مسند درس کے انسان تھے اور ان کے فضل و کمال کیلئے یہی کافی تھا۔ لیکن حضرات بریلی نے محض اس وجہ سے کہ آپ نے اپنی زندگی کے ایک دور میں حضرۃ الامام شاہ محمد اسماعیل شہید کے افکار و نظریات کے خلاف آواز اٹھائی تھی (جس کی تفصیل ہم اپنی کتاب حیات و افکار شاہ اسماعیل میں دے رہے ہیں۔) دنیا جہان کی سعادتیں ان کے دامن میں بھر دینے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ وہ خود تنگی داماں کی شکایت کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس ہم آپ کو اختصار کے ساتھ ایک حقیقی مجاہد حریت سے روشناس کراتے ہیں اور وہ ہیں اس دور کے احمد بن حنبل یعنی مولانا یحییٰ علی صادق پوری جو دولت و ثروت کے لحاظ سے علامہ فضل حق سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ پٹنہ شہر (دار الحکومت بہار) میں ان کے مسمار شدہ مکانات پر پٹنہ میونسپلٹی کی عمارت اور ایک پورا

بازار بنا ہوا ہے۔ اور دیسی جائیداد کا کوئی حساب نہیں۔ بہت بڑے صاحب علم اور صاحب کشف و کرامات ہیں۔ لیکن سید احمد شہید کی تحریک کے امیر ہونے کے باعث انگریز نے سنت یوسفی پر عمل پیرا ہونے کیلئے مجبور کر دیا ہے۔ پھانسی کی سزا کا حکم ہوا تو اس قدر مسرت ہوئی کہ خود انگریز کمشنر اور جج انگشت بدنداں رہ گئے۔ پوچھا تو بتایا کہ ہم اللہ کے راستے میں پھانسی کو شہادت تصور کرتے ہیں اور شہادت سے بڑا اعزاز کسی مسلمان کیلئے کوئی نہیں ہو سکتا۔ انگریز نے کہا کہ ہمارا مقصد تمہیں خوش کرنا نہیں، تکلیف دینا ہے۔ اگر پھانسی تمہیں مرغوب ہے تو ہم اسے بدل کر عمر قید بعبور دریائے شور مع ضبطی جائیداد و انہدام قبور و مکانات کی سزا دیتے ہیں۔ اور پھر آزادی کے اس متوالے کو کالا پانی پہنچایا گیا جہاں رہٹ چلانے پر لگا دیا گیا۔ خون کے پیشاب آنے لگے۔ گھر سے خط آیا کہ عین عید کے روز انگریزوں نے بچوں اور عورتوں کو گھروں سے نکال کر مکانات مسمار کر دیئے۔ پھر کیا ہوا؟ ـــــ مولانا محمد میاں مرحوم لکھتے ہیں:

"کس کا کلیجہ ہے کہ ایسی ہوش ربا اور لرزہ خیز خبریں سنتا رہے۔ اور متاع عقل و ہوش برباد نہ کر دے۔ مگر اللہ کا فضل و کرم جس کو چاہتا ہے۔ بے پناہ ضبط و تحمل عطا فرما دیتا ہے۔ جہاد و حریت کے شیدائی اور خون شہادت کے یہ آرزومند جس وقت گھروں سے نکلے تھے۔ تو یہ مستقبل سامنے تھا۔ وہ سب کچھ قربان کر دینے کا تہیہ کر کے ہی نکلے تھے صرف ایک تمنا تھی کہ محبوب حقیقی کی نظر میں شرف قبولیت حاصل کریں۔ وہ دنیا میں نہ کسی معاوضے کے آرزومند تھے نہ کسی شکریئے کے امیدوار تھے۔ بس کوئی سا اشارہ جس سے رضائے مولیٰ کا پتہ چلے۔ زخم دل کا مرہم اور تمام بے چینیوں اور پریشانیوں کیلئے تریاق مسرت تھا۔ چنانچہ ان تمام حوادث کے سننے کے بعد ایک خط کے چند فقرے بھی ملاحظہ کر لیجئے۔ یہ خط اسی شہید وفا (یحییٰ علی) نے اپنی اہلیہ کو لکھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یحییٰ علی کی طرف سے بخدمت ام حبیبہ ام محمد یوسف سلمہا اللہ تعالیٰ

ضروری لکھنا یہ ہے کہ خط سے نور چشم محمد حسن مدعمرہ کے حال انہدام دونوں مکانوں کا معلوم ہوا۔ البتہ دل کو قلق ہوا اور صدمہ بہت گذرا کیونکہ مکان سکونت قدیم سے خصوصاً وہ مکان جس میں ذکر اللہ بہت ہوا ہو۔ اور کار و بار فریضہ (جہاد) بہت اجراء پائے ہوں۔ مومنین کو انس و محبت بطور اہل و عیال کے ہوتی ہے۔

اسی روز شب کو روح انور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوا تبسم کناں فرمانے لگے کہ "البتہ انہدام سے مکانوں کے مالکان کو خصوصاً نسواں کو رنج والم بہت ہوا ہے اور ہونے کی

جگہ ہے۔ اور ان آیات کریمہ کو زبان مبارک سے ارشاد فرمایا: وبشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اولئک علیھم صلوات من ربھم ورحمۃ واولئک ھم المھتدون۔ ربنا افرغ علینا صبراً وتوفنا مسلمین۔ عسیٰ ربنا ان یبدلنا خیراً منہ انا الی ربنا منقلبون۔ اور فرمایا ان آیات کریمہ کو ورد زبان رکھو۔ عبادت خانے اور مسجد اقصیٰ اور مکانات انبیاء بخت نصر اور جالوت کے ہاتھوں انہدام پائے تھے۔ آخر منہدم کرنے والے نسیاً منسیاً ہو گئے اور یہ مقامات متبرکہ از سر نو بنا ہوئے۔ تم بھی اپنے رب سے ایسی ہی امید رکھو ...... اللہ تعالیٰ کا بہت شکر کرو کہ تم ایسے امتحان کے لائق ٹھہرے" بعد اس مکاشفہ کے میں نے بہت انشراح وتسکین پایا اور اپنے بڑے بھائی (مولانا احمد اللہ) کو آگاہ کیا۔

اے فدائے من فدائت جان من   جملہ فرزندان وخان ومان من

اقتباس از مکتوب مورخہ ۲۱ جمادی الاول روز یکشنبہ ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء (علماء ہند کا شاندار ماضی جلد ۳ ص ۱۷۶ تا ۱۸۱ مطبوعہ دہلی۔)

اس وفا کے پتلے یحییٰ علی کا نام آپ نے کبھی سنا؟ پریس بریلویوں کے ہاتھ میں ہے۔ اخبارات میں دیکھو تو خود ساختہ مجاہد کبیر نظر آتے ہیں۔ رسائل ان کے ذکر سے بھرے ملتے ہیں۔ ریڈیو سے بھی یہی سنا جاتا ہے ـــــ (ریڈیو پاکستان لاہور نشری تقریر از غلام مرتضیٰ مورخہ ۷۵-۱۲-۶ بوقت ۱۵-۵ شام) لیکن جن کی ہڈیوں کی خاک سے ہماری آزادی کا قصر رفیع تعمیر ہوا ہے۔ داستان میں ان کا نام تک گوارا نہیں کیا جاتا۔ اور ان کے نام لیواؤں کو انگریز سرکار کا پشتینی وفادار ہونے کے طعنے دیئے جاتے ہیں۔

ہم بڑے ادب کے ساتھ بریلوی حضرات سے پوچھتے ہیں کہ اگر سید احمد شہید اور حضرۃ الامام شاہ محمد اسماعیل کی تحریک انگریز کی حمایت میں خود ان کے ایماء پر شروع کی گئی تھی اور امت مسلمہ کے یہ اکابر انگریز کے ایجنٹ تھے تو پھر ان سزاؤں کے کیا معنی؟ کیا دوستوں اور وفاداروں کو انعامات اور جاگیریں عطا کی جاتی ہیں یا قید وبند اور ضبطیٔ جائیداد کے تمغوں سے نوازا جاتا ہے۔ ہم ذیل میں ان مجاہدین حریت کی ایک مختصر فہرست درج کرتے ہیں جو اس تحریک سے منسلک تھے اور انگریز کے پنجۂ استبداد میں جکڑے گئے ساتھ ہی ان سزاؤں کی نشاندہی بھی کئے دیتے ہیں۔ جو مختلف اوقات میں ان پر لاگو کی گئی۔

مولانا یحییٰ علی صادقپوری	حبس دوام بعبور دریائے شور۔ ضبطی جائیداد۔ انہدام مکانات۔ خاندانی قبرستان سے بزرگوں کی ہڈیاں بھی اکھاڑ باہر نکالی گئیں۔ (پہلے آپ کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی)
مولانا محمد جعفر تھانیسری	حبس دوام بعبور دریائے شور۔ وضبطی جائیداد

مولانا عبدالرحیم صادقپوری	حبس دوام بعبور دریائے شور و ضبطی جائیداد۔
قاضی میاں جان	〃 〃 〃
میاں عبدالغفار	〃 〃 〃
منشی عبدالکریم	〃 〃 〃
عبدالغفور	〃 〃 〃
الٰہی بخش	〃 〃 〃
حسین عظیم آبادی	〃 〃 〃
حسین تھانیسری	〃 〃 〃
محمد شفیع انبالوی	سزائے موت بعد از قید بدل دی گئی (لاش گورستان جیل میں دفن کی جائے) ضبطی جائیداد جو ۱۸۶۵ء کے ایام میں کم از کم پچاس لاکھ روپیہ پر مشتمل تھی۔
مولانا احمد اللہ صادقپوری	حبس دوام بعبور دریائے شور۔ ضبطی جائیداد۔ انہدام مکانات
مولانا مبارک علی	〃 〃 〃 〃
مولانا تبارک علی	〃 〃 〃 〃
مولوی امیر دین	〃 〃 〃 〃
ابراہیم منڈل	〃 〃 〃 〃
امیر خان	سزائے قید اور ضبطیٔ جائیداد (جو اس زمانہ میں کم از کم ایک کروڑ روپیہ مالیت رکھتی تھی)
سید نذیر حسین دہلوی	راولپنڈی جیل میں ایک سال قید۔ دوران قید روزانہ پھانسی کی دھمکی اور تشدد۔ اس کے بعد گھر میں نظر بندی۔ پیشگی اجازت کے بغیر کہیں جانا ممنوع تھا۔
مولانا فضل الٰہی وزیرآبادی	۱۹۱۹ء سے مفرور قرار دئے گئے۔ ہند میں ان کا داخلہ قیام پاکستان تک ممنوع رہا۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۸ء تک قید اور رہائی ترکوں کی طرف سے انگریز کے ساتھ شرائط صلح میں ایک شق کے باعث ہوئی کہ تمام سیاسی قیدی رہا کر دئے جائیں۔ ورنہ انگریز آپ کو پھانسی دینے پر تلا ہوا تھا۔
محمد اسحاق دہلوی	پہلی جنگ عظیم کے دوران کا ایک مجاہد قیدی جس کی ہتھیلیوں میں کیل ٹھونکے گئے۔
حاجی دین محمد	حبس دوام بعبور دریائے شور مع ضبطی جائیداد۔
امین الدین	

باقی صـ۵۳ پر